حالیؔ کی غزل میں عاشق کے تصور کی مقصدی کڑیاں

ڈاکٹر فرحانہ قاضی

ABSTRACT:
Althaf Hussain Halli is a renowned poet and prose writer. He was an active worker of Sir Sayyad Movement and ideologically associated with Ali Garh Movement. That's why in his poetry he gave a realistic concept of love. For him love is not for one's own emotional satisfaction. Therefore according to him love (Ishq) should use for the benefit of community. The following article is a brief study of his concept of lover (Ashiq) in his lyrical poetry (Ghazal)

تلخیص: ۱۸۵۷ء کے بعد زمانے کے تغیر کے ساتھ غزل اوراس کے تصورات تغیرات سے دوچار بھی ہوئے اور حتی الامکان نئے عشقیہ مزاج اور سماجی حالات سے ہم آہنگ بھی ہوئے نیز اس دوران میں اس نے سیاسی ، مذہبی اور علمی زندگی کی ترجمانی بھی کی لیکن اپنے رکھ رکھائو میں فرق نہ آنے دیا اور یہ کمال اُن مصلحانِ قوم و ادب کا تھا جنہوں نے غزل کی مینا کو عصری شعور کے شراب کے لیے استعمال تو کیا مگر اس کے سانچے کو توڑ پھوڑ کر بدنما کرنے کی کوشش نہیں کی ۔ دراصل یہ اس سوچ کی دین تھی کہ ادب تخلیقِ حسن کا وسیلہ بھی ہے اور ترجمانِ حیات بھی لہٰذا اس میں افادی پہلو بھی ہونا چاہیے اور جمالیاتی پہلو بھی غزل میں افادیت اور حسن کے امتزاج کے مدرسِ اول بلاشبہ حالیؔ ہی ہیں جنہوں نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد زمانے کے مزاج کو سمجھ کر مضامینِ غزل میں تبدیلی کا نہ صرف نعرہ بلند کیا بلکہ خود کلاسیکی مزاج کی قربانی دے کر جدید طرز کی غزل گوئی شروع کیحالیؔ دراصل عبوری دور کی پیدوار تھے جب ایک معاشرہ ختم ہونے کے قریب تھا اور دوسرے معاشرے کا عکس دھندلا نظرآرہا تھاگویا انہوں نے ایک نظام اورمعاشرے کو دم توڑتے دیکھا اوراس توڑ پھوڑ نے ان کے شعور کی نشوونما کی۔انہوں نے شاعری کو جدید رجحان سے آشنا کیا ۔ لکھنوی اور دہلوی حد بندیاں ختم کرکے شعر کو عوام کی ملکیت بنا دیا اور اس کو با مقصد بنایا ۔ نیز عشقیہ موشگافیاں ترک کرکے ذاتی تجربات اور حیات و کائنات کے گونہ مسائل کو موضوع بنایا اور اس طرح روایتی

(*اسسٹنٹ پروفیسر، کالج آف ہوم اکنامکس، جامعۂ پشاور

تصورِ عاشق میں انقلابی تبدیلی کا آغاز کیا۔

کلیدی الفاظ: الطاف حسین حالی، کلاسیکی غزل،۱۸۵۷ء کا انقلاب ، عبوری دور،سیاسی اور سماجی تغیرات،سماجی اصلاح ، حقیقت پسندی ۔

۱۸۵۷ء کے بعد کے شعراء بالعموم اور داغؔ دہلوی کی غزل نے بالخصوص عاشق کا جو تصور مرتب کیا وہ کچھ انفرادی خصوصیات رکھنے کے باوجود کافی حد تک اُس تصور سے ملتا جلتا ہے جو روایتی غزل نے ترتیب دیا تھا ۔ بالخصوص اس میں لکھنوی مزاج کے عاشق کی جھلک نظرآتی ہے ، جس کے لیے عشق کام و دہن کی لذت کا نام ہے اوراس میدان میں دکھ اُٹھانے کا یا کوئی انقلابی صورت پیدا کرنے کا یہ کچھ زیادہ خواہاں نظرنہیں آتا بلکہ صرف داغؔ ہی نہیں اس دور کے کم و بیش تمام روایت پسند شعراء کا تصورِ عاشقکچھ اسی نوعیت کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناقدین اس زمانے کے عشق اور عاشق کو لکھنوی روایت کا حصہ ہی سمجھتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر سید اعجاز حسین اپنے مضمون '' داغؔ کا فن اور شخصیت '' میں لکھتے ہیں:

''اگر آپ بے لوث ہو کر ذرا غور کے ساتھ اردو شاعری کے اس دور کا جائزہ لیں جو داغؔ سے ذرا پہلے اور کچھ بعد تک تھا تو آسانی سے محسوس ہوگا کہ اس دور کا معشوق طوائف ہے اور عاشق تماشبین ہے۔ وفا ، جفا کی حکایتوں میں، معشوق کے برتائو میں ، طرزِ معاشرت میں ، غرض کہ اکثر باتوں میں آپ کو اس کے تائیدی ثبوت مل جائیں گے ۔ لوگوں کا عشق بازاری تھا ۔ اس زمانے میں خواہش کا نام عشق ، نمائش کا حسن تھا۔''(۱(

لیکن زمانے کا انقلابی مزاج اس رنگ کو تادیر برقرار رکھنے پہ تیار نہیں ہوتا اور زندگی کے گوناں گوں مسائل عشق کے اس انداز کو پسِ منظر میں دھکیل دیتے ہیں ۔کیونکہ یہ وہ وقت تھا جب شاعری درباروں سے گلی کوچوں کی طرف منتقل ہورہی تھی اور عوام میں اس قسم کے عشق کا یارا نہ تھا نہ وہ اس کا حق ہی پورے طور پر ادا کرسکتے تھے ۔ چنانچہ اُنہوں نے ایسی عشق و عاشقی کا انکار کردیا اور یہیں سے غزل کی تاریخ کا یکسر مختلف اور نیا عاشق ملتا ہے ، باشعور ، با عمل اور محترک ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس انقلاب سے قبل عاشق کے تصور میں تبدیلی اس لیے بھی نظرنہیں آتی کہ خود برصغیر کے کلاسیکی معاشرے میں بھی تبدیلی کی کوئی ایسی لہر نہیں اُٹھی تھی ، جو شعری مزاج کے دھارے کے رخ کو بدل دیتی ۔ اس کے برعکس کلاسیکیت کے اُس دور میں سیاسی اور سماجی تغیرات اگر آئے بھی تو ان کا اثر خاطر خواہ نہیں ہوا اورعوامی سطح پر کوئی تبدیلی نظر نہ آئی ۔ گویا سماجی زندگی ہمیشہ سکون سے ہم آغوش رہی۔ (نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے اثرات کے ماسوا) بیرونی حملہ آور آتے رہے ، سلطنتیں بدلتی رہیں۔ شاہانِ وقت تبدیل ہوتے رہے، خون کے دریا بھی بہے ، ایک کا عروج اور دوسرے کا زوال بھی آتا رہا لیکن ان تمام باتوں کا عوام کی زندگی کے مسائل پر کوئی خاص اور مستقل اثر نہ ہوا ، بلکہ وہ جہاں تھے وہیں رہے، یہی وجہ ہے کہ غزل میں عوام کی نمائندگی بھی صحیح طور پر نہیں ملتی۔ لہٰذا وہی درباری عشق اور وہی درباری عاشق و معشوق ۔یعنی اونچے اور اعلیٰ طبقے کے افراد ، جن کے لیے محبت کی معاملہ بندی ہی سب کچھ تھی، جو وصل و ہجر کو ہی دنیا کا سب سے اہم اور بڑا مسئلہ سمجھتے تھے ، جن کے لیے رقابت ہی سب سے بڑی مصیبت تھی اور جن کی دنیا بس ایک دوسرے پر ختم ہوتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ذاتی عشق کے اس کینوس میں انہیں کچھ اور دِکھ ہی نہیں سکتا تھا ۔ چنانچہ نہ انہیں آٹے دال کا بھائو معلوم تھا نہ زیست کے دیگر

چھوٹے بڑے مصائب سے آگاہی تھی۔ یہ تو شکر ہوا کہ انقلاب آیا اور ان حضرات کے دل و دماغ پہ بھی اس کا کچھ اثر ہوا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانیوں کی دنیا بدل جاتی ہے اور اس کے بعد سے ہی اصل معنوں میں غزل کا عاشق زندگی کو اجتماعی نظر سے دیکھنا شروع کردیتا ہے۔ گویا صدیوں کی سلطنت اور عظیم تہذیبی ورثے کے بدلے میں سیاسی اورسماجی شعور کی دولت مل گئی ۔ دلچسپ اوراچھی بات یہ ہے کہ زمانے کے تغیر کے ساتھ غزل اوراس کے تصورات تغیرات سے دوچار بھی ہوئے اور حتی الامکان نئے عشقیہ مزاج اور سماجی حالات سے ہم آہنگ بھی ہوئے نیز اس دوران میں اس نے سیاسی ، مذہبی اور علمی زندگی کی ترجمانی بھی کی لیکن اپنے رکھ رکھائو میں فرق نہ آنے دیا اور یہ کمال اُن مصلحانِ قوم و ادب کا تھا جنہوں نے غزل کی مینا کو عصری شعور کے شراب کے لیے استعمال تو کیا مگر اس کے سانچے کو توڑ پھوڑ کر بدنما کرنے کی کوشش نہیں کی ۔ دراصل یہ اس سوچ کی دین تھی کہ ادب تخلیقِ حسن کا وسیلہ بھی ہے اور ترجمانِ حیات بھی لہٰذا اس میں افادی پہلو بھی ہونا چاہیے اور جمالیاتی پہلو بھی لیکن افادیت کے لیے اس کا حسن مجروح کرنا مناسب نہیں اور نہ محض حسن کاری کرکے افادیت کو بھول جانا درست ہے۔ ادب کے اس مرکب روپ کے بارے میں ڈاکٹر اے بی اشرف کا یہ قول ، اُس وقت کے مصلحینِ ادب پر صادق آتا ہے ، جس میں وہ کہتے ہیں:

''ادیب کا کام تخلیقِ حسن کے ساتھ ساتھ زندگی کے حقائق کی عکاسی کرنا بھی ہے ۔ ادب زندگی ، معاشرے اور تہذیب کاترجمان ، عکاس اور نقاد ہوتا ہے ۔ یہ انسانی جذبات و احساسات اور بلند سے بلند تر خیالات کا فنی اظہار ہے اس میں سماجی اور افادی پہلو بھی ہونا چاہیے ، فنی اور جمالیاتی بھی ۔''(۲(

ادب بالخصوص غزل میں افادیت اور حسن کے امتزاج کے مدرسِ اول بلاشبہ حالیؔ ہی ہیں جنہوں نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد زمانے کے مزاج کو سمجھ کر مضامینِ غزل میں تبدیلی کا نہ صرف نعرہ بلند کیا بلکہ خود کلاسیکی مزاج کی قربانی دے کر جدید طرز کی غزل گوئی شروع کی اور یہیں سے عاشق کے انقلابی تصور کاآغاز ہوتا ہے جس نے نہ صرف ادب میں نمایاں تبدیلی سے ہمیں روشناس کرایا بلکہ پوری زندگی میں مقصدیت اور حرکت و عمل کا عنصر شامل کر دیا ۔چنانچہ اب یہ غزل صرف زلف و رخسار کی کہانی اور ہجرو و صال کی داستان نہیں بلکہ اس میں زندگی کی پوری وسعتیں سما گئی ہیں۔''(۳(

اگر حالیؔ کے تصورِ عاشق کا تجزیہ کیا جائے تو کچھ ایسے حقائق سامنے آتے ہیں جن سے اُن کی شخصیت کی قدر و قیمت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ حالیؔ دراصل عبوری دور کی پیدوار تھے جب ایک معاشرہ ختم ہونے کے قریب تھا اور دوسرے معاشرے کا عکس دھندلا نظرآرہا تھاگویا انہوں نے ایک نظام اورمعاشرے کو دم توڑتے دیکھا اوراس توڑ پھوڑ نے ان کے شعور کی نشوونما کی۔ چنانچہ انہوننے ہوا کی سمت کو دیکھا، سمجھا اوراس سے یہ سیکھا کہ جو قوم غلامی اور مفلسی و پستی کے مذلّت میں گر چکی ہو ، اس کو عشق و عاشقی کی باتیں کرنا زیب نہیں دیتا، لہٰذا ان حالات میں شاعروں کا اس قسم کی باتیں کرنا قومی شعورکا مذاق اُڑانے کے مترادف ہے۔

لہٰذا اسی تصور کو ذہن میں رکھتے ہوئے انہوں نے شاعری کو جدید رجحان سے آشنا کیا ۔ لکھنوی اور دہلوی حد بندیاں ختم کرکے شعر کو عوام کی ملکیت بنا دیا اور اس کو با مقصد بنایا ۔ نیز عشقیہ

موشگافیاں ترک کرکے ذاتی تجربات اور حیات و کائنات کے گونہ مسائل کو موضوع بنایا اور اس طرح روایتی تصورِ عاشق میں انقلابی تبدیلی کا آغاز کیا۔

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ حالیؔ دو معاشروں اور تہذیبوں کے سنگم پر جنم لینے والے شاعر تھے ، اس وجہ سے اُنہوں نے زندگیکے دو رخ دیکھے تھے ، انقلاب سے پہلے کا روایتی اور کلاسیکی رنگ اور انقلاب کے بعد کا جدید اور مغربی رنگ ۔ چنانچہ ان کے تصورِ عاشق پر بھی ان دونوں رنگوں کی پرچھائیاں پڑی ہیناور چونکہ وہ غزل کے مزاج سے آشنا تھے اور زمانے کی رفتار کے نباض بھی تھے اس لیے شروع میں اُن کے ہاں کلاسیکی مزاج کا عاشق نظرآتا ہے مگر آہستہ آہستہ کچھ اپنے اصلاحی مزاج کے باعث اور کچھ سرسید کے اثر میں اُن کی غزل کا عاشق بھی بدل جاتا ہے اور محبوب بھی ۔

اگر ان کی ابتدائی غزل کے تصور پر نظرڈالی جائے تو یہ ایک مخلص ، باوفا ، منکسر مزاج ، صلح جو ، ایثار صفت اور وضعدار عاشق ہے جو اپنے ذاتی وقار کا خیال رکھتے ہوئے عشق کے آداب بجا لاتا ہے ، جو دل کی گہرائیوں سے محبوب کو چاہتا ہے مگر اس کی رسوائی کا سوچ بھی نہیں سکتا اور نہ بدنامی برداشت کرسکتا ہے ۔ یہ ایک ایسا عاشق ہے جس کے دل میں محبت کا درد موجزن ہے مگر یہ طلاطم اُس سے کسی اوچھی حرکت کا ارتکاب نہیں کراتا ۔وہ وصل کی خواہش رکھتا ہے مگر اس کے لیے اپنے مقام سے گرنا اسے منظور نہیں۔ نیز یہ ایک ایسا عاشق ہے جس کے جذبے میں کوئی کمی نہیں بلکہ شدت ہے لیکن دلی حالت کے بے قابو ہونے پر بھی یہ بے باک نہیں ہوا کیونکہ اسے اپنی عزت بھی عزیز ہے اور محبوب کی بھی ۔ اس نفاستِ طبع نے اس عاشق کو ہوا و ہوس کے کوچے سے نکال کر پاکیزگی اورتقدس عطا کی ہے ا س لیے اس میں ایک اخلاقی قوت پیدا ہوگئی ہے ۔

اس وضعدار اور شریف عاشق کی شخصیت میں ایک اورعنصر بھی ہے اور وہ یہ کہ یہ خوفزدہ معلوم ہوتا ہے گویا ڈر رہا ہو کچھ دل سے بھی اور کچھ آسمان سے بھی۔ غالباً اسی خوف اور افسردگی نے اسے مزاج کا اعتدال دیا ہے۔ جس کے باعث یہ جذباتی تشنج کا شکار نہیں ہوتا۔ یوں بوالہوسی اور کامجوئی سے بچ کر یہ شخص رندِ شاہد باز بننے کی بنائے رند پاکباز بن جاتا ہے ۔ نیز ایک اورخوبی جو اس کی ذات میں نظرآتی ہے وہ امرد پرستی کے کوچے سے بچ نکلنا بھی ہے۔ حالیؔ سے پہلے کے عاشق میں امرد پرستی کا ایک واضح اور نمایاں رجحان ملتا ہے مگر حالیؔ کا قدیم روایتی تصورِ عاشق اس اثر سے گریز کرتا دکھائی دیتا ہے ۔

اس عاشق کی شخصیت کا ایک اور خاصہ یہ ہے کہ کہ نہ اس میں ہرجائی پن ہے اور نہ کھل کھیلنے کا شوق نہ بدنامیوں اور بدعنوانیوں کو مزہ لے لے کر بیان کرنے کا چسکہ ہی اسے لگا ہے۔ بلکہ یہ تو ایک ایسا آدمی ہے جس کا عشق زمانے کے سرد و گرم میں پنپنے ہی نہیں پایا ۔ ان نامساعد حالات میں اس کا عشق ختم نہیں ہو جاتا بلکہ دل کی گہرائیوں میں بہرطور موجود رہتا ہے ۔ اگرچہ ظاہری طور پر یہ ترکِ عشق کا اعلان بھی کردیتا ہے اور دعا بھی کرتا ہے مگر اس کا دل اس کے کہنے میں کب آتا ہے ؟ یہی وجہ ہے کہ ساری زندگی کوشش کرکے بھی یہ جوانی کے جذبات و احساسات اور خواہشات کو بھلا نہیں پاتا اور بڑھاپے میں بھی انہیں یاد کرتا رہتا ہے ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ عمر بھر یہ اپنے

ارمان نکلنے نہیں دیتا بلکہ اُنہیں سنبھالے رکھتا ہے اور احتیاط سے کام لیتا ہے ۔ اس لیے وہ ہمیشہ نہاں خانۂ دل میں موجود رہتے ہیں اور عاشق کو ہمیشہ بے قرار رکھتے ہیں۔

حالیؔ کے قدیم تصورِ عاشق میں ایک ایسے کردار سے شناسائی ہوتی ہے جو دراصل محبت میں حزم و احتیاط ، توازن اور اعتدال کا قائل بھی ہے ، جسے بدنامی کا دھڑکا بھی لگا رہتا ہے، جو کوچۂ عشق میں جانا بھی چاہتا ہے لیکن اس کی تپش اور گرمی برداشتبھی نہیں کرپاتا ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے عشق میں شوریدہ سری پیدا نہیں ہونے پاتی اور یہ ایک معتدل مزاج شخص کا عشق معلوم ہوتا ہے ۔ حالیؔ کے اس پاکباز عاشق کے بارے میں مجتبیٰ حسین بڑے واضح انداز میں کہتے ہیں:

''ان کی غزلیں بے باک نہیں ہوسکیں اور اُن میں ایک خاص قسم کا ''صالح عاشق '' ملتا ہے ۔ -- حالیؔ سایۂ عشق بتاں سے بھاگنے لگے اور اُن کی ''سماج سدھار'' خواہش کو یہ موقع مل گیا کہ اس نے اُن کی اس عشقیہ رگ کو آسانی سے کچل کررکھ دیا-- ہم اس سے انکار نہیں کرسکتے کہ ان میں جیتا جاگتا عشق ملتا ہے یہ ضرور ہے کہ ان کی غزل میں دیوانگیٔ عشق نہیں ہے ضبطِ عشق ہے ۔''(۴(

ان سب باتوں کے مطالعے سے جو نتیجہ اخذ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حالیؔ کی قدیم رنگ کی غزلوں میں ایک ایسا عاشق ملتا ہے جس کے دل میں محبت کا سوز و گداز موجود ہے عشق سے ملنے والی افسردگی و اُداسی بھی ہے ۔ مگر یہ عاشق قنوطیت کا شکار بالکل بھی نہیں۔ یہ جذبۂ عشق کے آگے بے بس تو ہے لیکن یہ بے بسی اس سے ایسی کوئی حرکت نہیں کراتی جس سے اس کی شخصیت کا وقار مجروح ہو ۔ اسے عشق سے ملنے والا کیف و سرور بھی نصیب ہے اور سرشاری و سرمستی بھی لیکن ہوشمندی جاتی نہیں رہی نیز روایتی اور رومانوی فرد ہونے کے ناطے اسے ناصح اور واعظ کے پند و نصائح اور ریاکاری سے بے زاری بھی محسوس ہوتی ہے لیکن بدکلامی اس کا شعار نہیں ۔ اسے محبوب دنیا کا حسین ترین شخص بھی نظرآتا ہے اور وہ اس کا ادب بھی کرتا ہے لیکن اُسے بدنام کرنے کی سوچ بھی اسے روا نہیں ہے۔ اس ضبط و احتیاط نے اس کے دل کی دنیا میں ایک خلش اور کسک بھی پیدا کر دی ہے جس کی چبھن اسے ساری زندگی محسوس ہوتی ہے لیکن پھر بھی یہ محبت کو دل سے نکال نہیں پاتا ۔

اس عاشق کی دوسری اہم خوبی اس کے مزاج کی سادگی اور متانت و سنجیدگی ہے۔ اپنے سے پہلے عشاق کی طرح یہ کسی مسخرہ پن کا مظاہرہ بھی نہیں کرتا اور نہ چھینا جھپٹی اور طعن و تشنیع سے کام لیتا ہے ۔

نیز چونکہ یہ ایک کلاسیکی معاشرے کا فرد ہے جو اگرچہ زمانے کے ہاتھوں مکمل طور پر کلاسیکی نہیں رہ پایا مگر اس معاشرے نے اسے کچھ تہذیبی اقدار دی ہیں جن کی پاسداری اسے ہر حال میں ضروری معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس پاسداری نے اس کے جذبے کی وارفتگی اور والہانہ کیفیت کو کم نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس اسے سوقیت و ابتذال اور سطحیت سے بچا لیا ہے۔ اس عاشق کی شخصیت کی سب سے خوبصورت بات یہ ہے کہ اپنے زمانے کے دیگر شعراء کے تصوراتِ عاشق کی طرح یہ معاملہ بندی اور کنگھی چوٹی کے تذکروں میں دلچسپی نہیں لیتا بلکہ صالح ، سچے اور پاکیزہ و مطہر عشق کا نمائندہ ہے۔

مختصر یہ کہ قدیم رنگ اور ابتدائی دور میں بھی حالیؔ کا عاشق زمانے کی کجروی سے بچارہتا ہے ۔یہ ایک سیدھے سادے سچے اور پُر خلوص و پاکباز شخص کی صورت میں سامنے آتا ہے جس کی تربیت مذہب ، تصوف ، تہذیب اور اخلاقیات نے کی ہے، جسے عشق کے آداب سکھائے گئے ہیں اور نہ صرف سکھائے گئے ہیں بلکہ وہ پوری طرح ان پر عمل پیرا بھی ہوتا ہے مگراس کے باوجود یہ عشق کیسپردگی و والہانہ پن پر حرف نہیں آنے دیتا۔ ان سب باتوں کی دلیل کے لیے حالیؔ کی قدیم رنگ کی تقریباً ساری غزلیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مگر یہاں چند ایک اشعار پر اکتفا ء کرنا بہتر ہوگا:

بہت کام لینے تھے جس دل سے ہم کو
وہ صرفِ تمنا ہوا چاہتا ہے (۵(

اس نے اچھا ہی کیا حال نہ پوچھا دل کا
بھڑک اٹھتا تو یہ شعلہ نہ دبایا جاتا
عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا (۶(

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہوگئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت
کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت (۷(

آرہی ہے چاہِ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت
وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے
مینہ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت
گھٹ گئیں خود تلخیاں ایام کی
یا گئی کچھ بڑھ شکیبائی بہت (۸(
تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا (۹(

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے (۱۰(

اب بھاگتے ہیں سایۂ عاشق بتاں سے ہم

کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم (۱۱(

نہیں بھولتا اس کی رخصت کا وقت
وہ رو رو کے ملنا بلا ہوگیا (۱۲(

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں (۱۳(

دل سے خیالِ دوست بھلایا نہ جائے گا
سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا (۱۴(

کہتے ہیں طبعِ دوست شکایت پسند ہے
ہم شکوہ ہائے غیر بھی تحریر کر چکے (۱۵(

دنیا کی حقیقت نہیں جز حسرت و حرماں
چھل بل میں تم اس زال فسوں گر کے نہ آنا (۱۶(

نہ عیش خسروی رہے گا نہ صولتِ بہمنی رہے گی
رہے گی اے منعمو تو باقی دئیے کی کچھ روشنی رہے گی (۱۷(

جس کو غصے میں لگاوٹ کی ادا یاد رہے
آج دل لے گا اگر کل نہ لیا یاد رہے (۱۸(

دھوم تھی اپنی پارسائی کی
کی بھی اور کس سے آشنائی کی (۱۹(

تھا آفتِ جاں اُس کا اندازِ کماں داری
ہم بچ کے کہاں جاتے گر تیر خطا ہوتا (۲۰(

قلق اور دل میں سوا ہوگیا
دلاسا تمہارا بلا ہوگا (۲۱(

ابتدائے وفا ہے سر دینا
میری دیکھی نہ انتہا تو نے (۲۲(

بات جو دل میں چھپائے نہیں بنتی حالیؔ
سخت مشکل ہے کہ وہ قابلِ اظہار نہیں (۲۳(

وفا شرطِ الفت ہے لیکن کہاں تک
دل اپنا بھی تجھ سا ہوا چاہتا ہے (۲۴(

تقاضائے محبت ہے وگرنہ
مجھے اور جھوٹ کا تم پر گماں ہو (۲۵(

کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کو
پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا (۲۶(

حالیؔ کے قدیم رنگِ غزل اور تصورِ عاشق کے اس مطالعے سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ بنیادی طور پر وہ اُسی شعری روایت سے جڑے ہوئے تھے جو ابتدائے غزل سے ہوتے ہوئے میرؔ ، دردؔ ، غالبؔ ، آتشؔ ، مومنؔ اور دیگر کلاسیکی شعرا سے چلی آرہی تھی۔ روایت سے جڑے رہنے کے باعث ہی اُن کا عاشق اُن شخصی کوائف اور طرزِ مزاج کا حامل تھا جو اس خطے میں صدیوں سے چلا آرہا تھا۔ لیکن حالیؔ کی غزل کے ضمن میں یہ بات معلوم ہونا ضروری ہے کہ وہ ایک عبوری دور کے شاعر تھے یعنی زمانے کے دو رنگوں کے دیکھنے والے انسان یا پھر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے ابتدائی زندگی اور شاعری میں دو کشتیوں کے سوار تھے اور فیصلہ نہیں کر پارہے تھے کہ کس کشتی کو چھوڑا جائے اور کس پر سوار ہوا جائے ؟ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ فیصلہ ان کے لیے آسان تب ہوا جب وہ سرسید کے زیرِسایہ آئے اور علی گڑھ تحریک سے فکری طور پر وابستہ ہوگئے ۔ یقینا اس میں کچھ حد تک حقیقت پائی جاتی ہے مگر اصل بات یہ ہے کہ طبیعت کے اعتبار سے شروع سے ہی روایتی اور فرسودہ طرزِ غزل گوئی اور مذاقِ عشق اُنہیں کچھ خاص جچتا ہی نہیں تھا ۔ اگرچہ روایتی معاشرے کا فرد ہونے، کلاسیکی شعراء کی رفاقت و صحبت کے باعث اور کچھ عوامی مذاق کے پیشِ نظر وہ آغاز میں ویسی ہی روایتی اور عاشقانہ غزل کہتے رہے جو اُن سے پہلے کہی جارہی تھی مگر اُن کی ذہانت اور حکیمانہ سوچ نے ہوا کے بدلتے رخ کو بھانپ لیا ۔ چنانچہ ڈاکٹر وقار احمد رضوی کے مطابق:

''حقیقت یہ ہے کہ حالیؔ کی طبیعت کو عشق سے زیادہ لگائو نہ تھا وہ فطرت کی گود سے ایک اصلاحی ذہن اوردرد مند دل لے کر پیدا ہوئے تھے جو قومی تنزل اور ملت کی پستی کو دیکھ کر تڑپ

اُٹھتا تھا۔ وہ عشق کے کوچے کے نبرد آزمانہ تھے اور نہ عشق کی طرف ان کا جھکائو تھا دراصل وہ غزل سے اصلاحی کام لینا چاہتے تھے ، عشق کو وہ مقصدِ حیات بنانا نہیں چاہتے تھے ۔''(۲۷(

چنانچہ جب اُنہیں احساس ہوا کہ حالات کی ستم ظریفی کی ماری ہوئی قوم کے لیے عشق و عاشقی کی باتیں اور زلف و رخسار کے مضامین حشیش کا کام دے رہے ہیں تواُنہوں نے قوم کو نشے کی اس لعنت سے نجات دلانے پر کمر کس لی اور یہی وہ موقع تھا جہاں ہمارے کلاسیکی عاشق نے اپنی ذات تیاگ کر مادرِ وطن کی محبت کا راگ الاپا اور اپنی عشوہ ساز و غمزہ کار محبوبہ کے سحر سے نکل کرقوم کی اُجڑی ہوئی مانگ میں ستارے بھرنے کا عزم کیا۔ گویا بزمِ ناز کی دلکشی و دلفریبی سے دامن چھڑا کر رزمِ حق و باطل کے لیے نکل پڑا ۔ کیونکہ اسے احسا س ہوگیا تھا کہ اُس غزل خوانی کے دن تمام ہوگئے جس میں عشق و حسن کی گھاتیں لگتی تھیں۔ لہٰذا اس نے یہ اعتراف کرنے میں نہ دقت محسوس کی اور نہ دیر لگائی کہ:

ہو چکے حالیؔ غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا (۲۸(

اس کے بعد اس عاشق نے مکمل طور پر غزل خوانی ترک نہیں کی مگر غزل میں بے وقت کی وہ راگنی ضرور چھوڑ دی ۔عشق اور خیالی محبوب کی باتیں کی جاتی تھیں۔ اس نازک موقع پر جبکہ غزل کا وجود ختم ہوسکتا تھا ہمارے کلاسیکی عاشق نے یہ ایک ایسا انقلابی اقدام لیا اور اپنی ذہانت کا ایسا ثبوت فراہم کیا جس کی توقع اور امید اُس وقت سے پہلے اس سے نہیں کی جاسکتی تھی ۔ اس نے غزل کی ایما ئیت کو اپنے اور قوم کے مفاد میں استعمال کرتے ہوئے اسے عصری تقاضوں کے مطابق کردیا ۔ یہ دراصل وہ دور تھا جب انگریزسرکار نے اپنے ظالمانہ اور بہیمانہ طرزِ عمل اور سلوک سے ہندوستان کے در و دیوار پر خوف اور بے بسی طاری کردی تھی اور ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ اس کے خلاف کسی کو آواز بلند کرنے کی ہمت بھی نہیں ہوتی تھی ۔ ایسے میں غزل کے عاشق نے حالیؔ اور ان کے رفقاء کو مدد سے وہ کارنامہ سرانجام دیا جونا قابلِ فراموش ہے ۔ لہٰذا اس عہد میں جب کہ ذرا سی بات پر زبان کٹتی تھی ، اس عاشق نے اشاروں اور پردوں کی زبان استعمال کرنے کی اپنی زبان میں وسعت پیدا کی اور رمزیہ درپردگی اختیار کرتے ہوئے ایمائیت اور رمزیت کی روایتی خاصیت کو کام میں لا کر اپنا مافی الضمیر اس طرح بیان کیا کہ سمجھنے والے سمجھ گئے اور درپردگی کے پیچھے چھپے مفہوم کو پاگئے ۔ یہ درپردگی ایسی تھی جس میں احتجاج بھی تھا۔ دکھڑا رونے کا انداز بھی اور غم و غصہ نکال لینے کی گنجائش بھی ۔ یوں اس عمل کے نتیجے میں وہ عاشق جو مکمل کلاسیکی اور عاشقانہ مذاق رکھتا تھا ایک مجاہد بن گیا اور اگر مکمل مجاہد نہ بھی بن سکا تو اس راستے پر چل ضرور پڑا۔ یقینا یہ حالیؔ کی دین ہے جنہوں نے ایک جامد اور فرسودہ تصور اور کردار میں نئی توانائی بھردی اور اس کی رگوں میں توانا خون دوڑا دیا۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو اُن کے جدید تصورِ عاشق کا مطالعہ بہت ضروری ہو جاتا ہے اور جتنا ضروری اتنا ہی دلچسپ بھی ۔

اس جدید عاشق کے کردار کی سب سے اہم اور بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے یہ ادراک ہوگیا ہے کہ اس کی ذاتی عشقیہ مزاج کی پذیرائی ابتلاء کے اس دور میں ممکن نہیں۔ کیونکہ سماجی طور پر یہ ایک

ایسے دوراہے پر کھڑا ہے جہاں ایک دور مٹ رہا ہے اور اگر اس نے اپنا عشقیہ مزاج تبدیل نہ کیا تو مٹتے ہوئے دور کے ساتھ یہ بھی مٹ جائے گا۔ چنانچہ اس حقیقت کو جان لینے کے بعد یہ ایک باشعور اور معاملہ فہم فرد کا کردار نبھاتے ہوئے عشق و عاشقی کی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے اور اپنی ذات اور محبوب ، جذبۂ عشق اور معاملاتِ عشق کو بھول کر سماج کو سدھارنے اور قوم کو غفلت کی نیند سے جگانے کا تہیہ کر لیتا ہے ۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ حالیؔ کے قدیم عاشق کے مزاج میں پہلے سے بھی کچھ ایسے رجحانات موجود تھے جو اس دور کے سیاسی اور مذہبی کشمکش میں حصہ لینے کی طرف اسے لے جاسکتے تھے اور اس کاروایتی عشقیہ مزاج اپنی قدیم صورت میں بھی کچھ انفرادی رنگ لیے ہوئے تھا نیز اپنے عہد کے دیگر تصوراتِ عاشق سے مختلف بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ زمانے کی آواز پہ لبیک بھی سب سے پہلے حالیؔ کے عاشق نے ہی کہا اور پھر ''لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا'' کے مصداق دوسروں نے بھی اس کی آواز میں آواز ملائی ۔ اس طرح نئی اردو غزل میں نیا تصورِ عشق ، نیا تصورِ عاشق ، نیا ماحول ، نئی طرز فکر کے عناصر شامل ہو نے لگے ۔ روایتی عشقیہ رنگ کی جگہ مقصدیت ، اصلاحی رجحان اور حالاتِ حاضرہ کی تنقید و تشریح اور نمائندگی نے لے لی اور نیا عاشق ذاتی معاملات و شخصی واردات کے محدود دائرے سے نکل کر انسانیت ، کائنات ، مسائل حیات ، سماجی اصلاح ، سیاسی ، تاریخی اور قومی مسائل کے ساتھ ساتھ فلاحِ ملت وغیرہ جیسے موضوعات کی ترجمانی کو اہمیت دینے لگا۔ یہ یقینا حالیؔ کی جدوجہد اور انقلابی مساعی کا نتیجہ تھا۔ گویا نئے تصورِ عاشق کے کردار کے معمارِ اوّل بلاشبہ حالیؔ قرار پاتے ہیں ۔

عاشق کا یہ نیا تصور چونکہ اپنی نوعیت کا پہلا اور انوکھا تصور تھا اس لیے اس میں بے شمار ایسی چیزیں ملتی ہیں جو اس سے پہلے کسی عاشق میں نظرنہیں آتیں ۔ مثلاً اس سے پہلے کے عاشقوں کی نظروں کا محور و مرکز محبوب ہوتا تھا اور اس کے دل و دماغ پر ایک ایسی حسینہ کا قبضہ تھا جو اپنے حسن اور دلربائی میں یکتا تھی یا پھر ایک ایسے ظالم اور ستم گر کو دل دیا جاتا تھا جو محبوب سے زیادہ جلاد اور جنگجو معلوم ہوتا تھا جس کا کام عاشقوں کو مار ڈالنا ۔ ٹکڑے ٹکڑے کر دینا اور تبر و خنجر سے گھائل کردینا ہوتا تھا۔ گویا محبت نہ ہوئی لڑائی ہوگئی۔ اس طرح اُس دور میں محبت کرنا دشمنی مول لینے کے مترادف تھا۔ لیکن حالیؔ کے تصورِ عاشق کی نئی اور انوکھی خاصیت یہ ہے کہ اس نے عصری شعور رکھنے کے باعث ایسے محبوب کو چاہنے میں وقت ضائع کرنے کی بجائے لیلائے وطن سے عشق کیا۔ چنانچہ ان کے جدید عاشق کا محبوب بدل جاتا ہے اورمادرِ وطن اور قوم کی صورت اپنا لیتا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر پوری ملت محبوب کی صورت اپنا لیتی ہے اور اس عاشق کا آدرش کسی شخص کا وصل اور ملن نہیں بلکہ قومی زندگی بن جاتا ہے ، جس کو جھنجھوڑ کر جگانا اور ترقی کے کارواں میں شامل کردینا اس کا نصب العین بن جاتا ہے ۔ دراصل اسے جب اس بات کا یقین ہوگیا کہ شخصی محبتیں انسان کو اجتماعی دنیا سے کاٹ کر رکھ دیتی ہیں اور بالخصوص یک طرفہ محبت میں ایک جیتا جاگتا مکمل انسان معاشرے کا ناکارہ پرزہ بن جاتا ہے جو سماج کے لیے مفید ہونے کی بجائے بوجھ کی صورت اپنا لیتا ہے اور وہ بھی ایسے حالات میں جب قوم کی نیّا ڈوبنے کے قریب

ہو اور مخالف قوتیں اس کی بیخ کنی کرنے کا سامان کر رہی ہوں، تو عشق کرنا دیوانگی سے کم نہیں ہوتا چنانچہ یہ عاشق بے دھڑک کہہ اُٹھتا ہے ۔

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اُٹھایا اُس کو بٹھا کے چھوڑا (۲۹(

لہٰذا اس کے بعد یہ عاشق قوم کے تن مردہ میں جان ڈالنے کی تگ و دو شروع کردیتا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سب سے پہلے تو یہ خود اپنی شخصی خامیوں پر نظرکرتا ہے اور اُنہیں دور کرنے کی سعی کرتا ہے۔ ایسے میں اسے اپنی کچھ اخلاقیکمزوریاں نظرآتی ہیں جن کے باعث بدنامی اس کا مقدر بن چکی ہوتی ہے مثلاً امرد پرستی کا سیاہ دھبہ جو ایک طویل عرصے سے اس کے دامن پہ لگ کر اس کے کردار کو داغدار بنا رہا تھا، یہ اسے دھونے کی کوشش کرتا ہے اور کافی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوتا ہے ۔ چنانچہ حالیؔ کی جدید غزلوں میں ایسے افکار اور موضوعات نہیں ملتے جن کے ڈانڈے امرد پرستی سے ملتے ہوں۔

اس عاشق کی ایک اور انفرادیت یہ ہے کہ اس کا ضمیر جو عرصے سے سویا ہوا تھا وہ جاگ جاتا ہے ۔ اسے احساس ہو جاتا ہے کہ اس کا دنیا میں آنے کا مقصد محض عشق و محبت کے ترانے گانا ، کسی شخص کی جدائی میں آہیں بھرنا ، زمانے کو محبوب کے مظالم کی تفاصیل بتانا ، قسمت کی خرابی کا رونا رونا اور لوگوں کے ہاتھوں اپنی بے قدری کی شکایت کرنا نہیں بلکہ کچھ اور ہے ۔ نیز زندگی صرف داخلی نہیں بلکہ انسان کو خارج کی دنیا سے بھی پالا پڑتا ہے اور اسے سماجی حیثیت میں بے شمار ذمہ داریاں بھی پوری کرنی پڑتی ہیں۔ جن سے یہ ابھی تک عہدہ برآ نہیں ہوسکا وجہ یہی عشق و عاشقی کا پرانا مرض جو اچھے بھلے کام کے آدمی کو نکما بنا دیتا ہے ۔ چنانچہ اب یہ عاشق اپنے ضمیر کی آواز پر کان دھرتا ہے اور نئی ذمہ داریوں سے روشناس ہوتا ہے (جو فی الحقیقت نئی تو نہیں تھیں مگر اسے ان کا شعور نہ تھا) اسے دنیا میں اپنی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے اور یہ سمجھ لیتا ہے کہ اب اسے ایک انقلاب لانے کی ضرورت ہے تاکہ زمانے کی ندی میں خس و خاشاک کی طرح بہنے سے بچ سکے ۔ فرائض سے عہد برآہونے کا یہی شعور ہے جو اس عاشق کے کردار میں عظمت پیدا کر دیتا ہے ۔ اس حوالے سے ڈاکٹر حسن اختر لکھتے ہیں:

''حالیؔ کی عظمت اس میں ہے کہ انہوں نے غزل کو دورِ جدید کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے قابل بنایا ورنہ غزل شاید اس مشینی دور میں زندہ نہ رہ سکتی ۔ ۔ ان کو معلوم ہو چکا تھا کہ پرانا مالOut of Date ہوچکا ہے اور اب نئے مال کی ضرورت ہے یہی نہیں بلکہ وقت کے تقاضوں کے مطابق گاہکوں کو کارآمد چیزوں کی افادیت سے آگاہ کرنا بھی لازمی ہے ۔ حالیؔ کی دکان سب سے الگ تھی اور مال بھی نایاب تھا لیکن گاہک زیادہ عرصہ بے خبر نہ رہے ۔ ان کی دکان پر گاہکوں کا ایسا تانتا بندھا کہ دوسری دکانیں قریب قریب بند ہوگئیں جو رہ گئیں انہوں نے بھی حالیؔ کا مال ہی فروخت کیا۔ منڈی پر حالیؔ کا قبضہ ہوچکا تھا۔ ''(۳۰(

ذمہ داریوں کے اس احساس اور اس کی بجاآوری نے اس عاشق میں ایک تبدیلی اور پیدا کی اور وہ یہ کہ اس سے پہلے کے عشاق جو اپنی ہی بے عملی اور تقدیر پرستی کے باعث جس مایوسی اور

قنوطیت کا شکار ہو چکے تھے اس کا خاتمہ ہوجاتا ہے ۔ نیا عاشق چونکہ خود حرکت میں آجا تا ہے اور حالات کا نہ صرف مقابلہ کرنے کی ٹھان لیتا ہے بلکہ خود میں یہ قوت بھی پیدا کر نے کا عزم کرتا ہے کہ وہ حالات کا رخ موڑ سکتا ہے لہٰذا اس میں امید اور آس پیدا ہو جاتی ہے اور یہ ایک رجائیت پسند فرد کے طور پر سامنے آتا ہے ۔ چنانچہ اب اس میں غم و یاس ، نااُمیدی و نامرادی نہیں بلکہ ایک سوزِ دروں اور جوش و ولولہ پیدا ہوجاتا ہے ، جو اسے عزم و حوصلے کی دولتعطا کردیتا ہے ۔ اب یہ محض گفتار نہیں رہتا بلکہ کردار بن جاتا ہے اور اس کے قول و فعل میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے نیز اس میں ایک ایسا شعورپیدا ہو جاتا ہے جو نہ صرف اس کے لیے بلکہ آئندہ نسلوں کے لیے بھی مشعلِ راہ بن جاتا ہے۔

یہ عاشق ایک اور حوالے سے بھی اپنے سے پہلے کے عشاق سے مختلف اور منفرد ہے اور وہ یہ کہ وہ عشاق ایک ایسے دور کے نمائندے تھے جب تصوف ایک عملی چیز کی بجائے محض '' برائے شعر گفتن '' بن گیا تھا ۔ چنانچہ وہ تصوف کو ایک انفعالی چیز اور فرار کا وسیلہ سمجھتے تھے اس لیے جسے دنیا کا سامنا کرنے میں دقت محسوس ہوتی وہ تصوف کا لبادہ اُوڑھ لیتا لیکن حالیؔ کا جدید عاشق اس قسم کا صوفی بننے سے انکار کر دیتا ہے ۔ وہ تصوف اور مابعدالطبیعاتی موشگافیوں کی جگہ مادی مسائل کو اہم جان کر ان کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

اس عاشق کی انفرادیت کا ایک اور رخ یہ ہے کہ جب اس کی نظر محبوب سے ہٹ کر اپنے پر پڑتی ہے اور اپنی امکانی قوتوں کے ساتھ ساتھ اس کا دھیان اپنی اخلاقی خامیوں کی طرف بھی ہو جاتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ عرصے سے یہ خود کو تو فرشتہ صفت ، معصوم اور صادق اور مخلص سمجھتا رہا جبکہ دوسروں کو مثلاً محبوب ، رقیب ، شیخ ، واعظ ، محتسب کو ریاکار ، بدخو ، بے عمل اور خود غرض و مطلب پرست سمجھ کر اُن کی تضحیک و تذلیل کرتا رہا مگر یہ کچھ زیادہ صحیح عمل نہیں تھا ۔

لہٰذا تکبر و تعلیٰ کے جس مرض میں یہ مبتلا ہوگیا تھا وہ نقصان دہ بھی تھا اور نامناسب بھی ، نیز اخلاقی لحاظ سے بھی درست نہیں۔ اس حقیقت کو جان لینے کے بعد یہ سب پر ہتک آمیز طنز وتعریض کے تیر برسانا کم کردیتا ہے ۔ یقینا یہ اس کی حقیقت پسندی اور سادگی و سچائی ہی کا ثبوت ہے۔ اس موقع پر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اب اگر یہ طنز کرتا ہے تو یہ غصے اور جھنجھلاہٹ کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ ایک تعمیری صورت اپنا لیتی ہے جو خود پر بھی ہوتی ہے اور ریاکاروں ، بے عمل واعظوں، جعلی قومی کارکنوں اور لذت پرست اشخاص پر بھی۔

اس کے علاوہ جب یہ عاشق خیالی اور تصوراتی دنیا سے منہ موڑ کر حقیقی دنیا کے معاملات ، عصری مسائل اور حالات حاضرہ پر نظر ڈالتا ہے تو اس میں عارفانہ بصیرت بھی پیداہو جاتی ہے اوراس کی نگاہوں میں گہرائی اور گیرائی در آتی ہے ۔ یہ چیز اسے شخصی اعتبار سے کئی صورتوں میں نواز دیتی ہے۔ مثلاً روایتی بد دماغی اور کجروی رکھنے والا عاشق اب مفاہمانہ اور ہمدردانہ رویہ اپنا لیتا ہے ، اب اسے نیکی کا ایک واضح تصور بھی مل جاتا ہے اور یہ انسانی شرف اور اخلاقی اقدار کا معیار بھی متعین کر لیتا ہے ۔ ان سب باتوں کے نتیجے میں یہ فرد ایک سیدھا سادہ ، حقیقت پسند ،

محب وطن ، سیاسی شعور کھنے والا ، دو ٹوک اور سچے کھرے لہجے میں گفتگو کرنے والا ، معتدل مزاج ، متین ، سنجیدہ ، بااخلاق ، صلح جو ، ناصحانہ افتادِ طبع کا حامل ، پاکیزہ اور مخلص و با عمل انسان بن جاتا ہے اور ایک ایسا عاشق بھی جس کی اس دور میں ضرورت تھی ، جس کی آمد سے ادبی زندگی میں ایک تموج پیدا ہوا اور جس نے اُردو ادب کو زندگی کا نہ صرف عکاس بلکہ خدمت گزار بھی بنا دیا۔ نیز جس کے آنے سے غزل اور زندگی کے فاصلے کم ہوتے ہوتے ختم ہوگئے اور ترقی پسندی کا بیج اردو ادب میں پڑ گیا، جس نے بحیثیت قوم اُبھرنے ، اپنا تشخص قائم کرنے اور دنیا سے خود کو منوانے کے قابل بننے میں مدد دی۔ یہیوجہ ہے کہ غزل میں تصورِ عاشق پر بحث کرتے ہوئے جب بات حالی تک پہنچتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ اُنہوں نے با مقصد عشق اور محب وطن اور مجاہد عاشق کا کردار متعارف کروایا اور یہیں سے روایتی تصور میں مقصدیت و واقعیت کی کڑیاں ملنی شروع ہوئیں ۔ جو آگے چل کر مزید پختہ اور واضح ہو جاتی ہیں اس سلسلے میں شجاعت علی سندیلوی کہتے ہیں:

''حالی کی شاعری غمِ عشق و غمِ روز گار کے ساتھ ساتھ غمِ ملت میں زیادہ ڈوبی ہوئی ہے۔ لیکن یہ غم یاس و ناامیدی ، قنوطیت و نامرادی کا غم نہیں بلکہ اس میں سوزِ دروں اور خونِ جگر کی آمیزش ہے--- وہ دنیا کے لیے مشعلِ راہ اور آخرت کے لیے زادِ راہ ہے۔''(۳۱(

حالیؔ کا یہ حقیقی اور بامقصد تصور اگرچہ ہمارے لیے اُس دور میں معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے بڑا مفید ثابت ہوا کیونکہ یہ ایک درد مند اور مخلص عاشق کا تصور تھا، جس کو بے بسی ، بے چینی اور بے قراری سکون نہیں لینے دیتی تھی ، جس کے دل میں قوم و ملک کا درد سمایا ہوا تھا، جو اپنی فریادِ جگر دوز سے اور اپنی آہ نیم شبی سے ہندوستان کے باشندوں کی روح تڑپا دینا چاہتا تھا، جس کا ظرف اتنا بڑا تھا کہ اُس نے اپنے ذاتی عشق اور شخصی ضرورتوں کی قربانی دے کر عروسِ ملت کا سہاگ بچانے کا عزم کیا اور جو بالآخر اس کام میں کامیاب بھی ہوا لیکن دوسری طرف ایک نقصان بھی ہوا اور وہ یہ کہ صدیوں سے قائم کلاسیکی عشق اور عاشق کا تصور بکھر گیا وہ تصور جو ہماری تہذیب کا حصہ تھا جو ہمارا ثقافتی ورثہ تھا ، جس میں ہم اہلِ مشرق کا مزاج جھلکتا تھا ، جو ہماری مشرقیت کا آخری نمونہ تھا نیز جس نے ہمیں اپنے داخل سے جوڑے رکھا تھا ۔ یقینا اس چیز کااحساس خود حالیؔ کو بھی تھا ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عقلی اور شعوری سطح پر نیز سرسید تحریک کے اثر کے باوجود آخر تک اُن کی غزل میں قدیم و جدید تصور کی ایک کشمکش اور آویزش بلکہ آمیزش کہنا زیادہ بہتر ہے نظرآتی ہے ۔لہٰذا ایک طرف وہ اپنے پرانے دفتر کو ختم بھی چاہتے ہیں تو دوسری طرف جوانی کی کجرائی کو یاد بھی کرتے رہتے ہیں۔ ترکِ عشق کی دعا بھی کرتے ہیں اور دل سے مجبور بھی ہیں ۔ اپنی پارسائی کا خیال بھی آتا ہے مگر آشنائی سے باز بھی نہیں رہتے ۔ نیز اُنہیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ مقصدیت اور اصلاح کے شوق میں اُن کے لہجے میں پند و نصائح سے پیدا ہونے والی بے کیفی اور خشکی پیدا ہوگئی ہے جس نے غزل کی کلاسیکی عشقیہ لے کو دھیما کردیا ہے مگر اس میں وہ بے بس اور مجبور تھے ۔ اُنہیں چونکہ اپنی غزل سے اصلاح کا کام لینا تھا لہٰذا دل کڑا کرکے اُنہوں نے ایسا کر ہی لیا ۔ اس معاملے میں اُن کی مثال بعینہ اُس جراح کی سی ہے جو ایک بظاہر صحیح سالم اورخوبصورت جسم پر نشتر چلاتا ہے اس مقصد کے لیے کہ اندر موجود مرض کا علاج اور ناسور

کا خاتمہ کرسکے۔ یقینا یہ عمل اس جراح کے لیے مشکل اور کھٹن ہوتا ہوگا مگر اُسے ایسا کرنا ہی پڑتا ہے ، ایک انسانی زندگی کو بچانے کی خاطر ۔ پھر حالیؔ کے سامنے تو کسی ایک انسان کی زندگی کا نہیں بلکہ پوری ہندوستانی قوم بلکہ ایک طرح سے پوری ملت اسلامیہ کی زندگی کاسوال تھا ۔ چنانچہ اُنہوں نے یہ تلخ گھونٹ بھی گوارا کر لیااور ایک جراح کا فریضہ بخوبی ادا کیا ۔ لہٰذا ہمیں بھی اُن کی اس مشکل کا خیال رکھتے ہوئے اُن کے تصور عاشق کا مطالعہ کرنا ہوگا ۔ کیونکہ یہ حالیؔ کی مجبوری تھی۔ اُس حالی کی جو ذاتی طور پر تو بے حد منکسر المزاج، ہمدرد ،نرم دل ، عجز پسند اور شریف النفس انسان تھے مگر تقدیر نے یہ مشکل کام اُنہی کے حصے میں ڈالا تھا جو اُنہوں نے کر بھی لیا ۔ اس لیے اگر یہ ایک خاص کمی اُن میں نظرآ بھی جاتی ہے تو اُن کا مطمعٔ نظر جان لینے کے بعد اس پر اعتراض کرنا نامناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ یا تو وہ روایتی غزل اوراس میں موجود تصورات کو بچاتے یا ہندوستانی قوم کی سیاسی اور سماجی بلکہ پوری زندگی کو بچاتے کیونکہ بقول فراق گورکھپوری:

’’جس وقت حالیؔ کی آواز کان میں پڑی اس وقت دلی میں زندگی اور شاعری کے چراغ کی روشنی پھیکی پڑ چکی تھی ۔‘‘(۳۲)

ان تفاصیل کی روشنی میں حالیؔ کے دیوان کا مطالعہ کیا جائے تو قدیم رنگ کے اشعار کی نسبت جدید تصورِ عاشق پر مبنی اشعار کی تعداد یقینا زیادہ ہے جن میں سے ہر شعر اُن کے تصور کو واضح کرنے میں مدد دیتا ہے مگر ان سب کا درج کرنا یہاں نہ مناسب ہوگا اور نہ ممکن۔ چنانچہ چند ایک نمائندہ اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

دیکھ اے امید کیجو ہم سے نہ تو کنارا
تیر ہی رہ گیا ہے لے دے کے اک سہارا

کھولی ہیں تم نے آنکھیں اے حادثوں ہماری
احسان یہ نہ ہرگز بھولیں گے ہم تمہارا

ہوتے ہی تم تو پیدل کچھ دئیے سوارو
ہے لاکھ لاکھ من کا ایک اک قدم تمہارا

افسوس اہلِ دین بھی مانند اہلِ دنیا
خود کام و خود نما ہیں ، خود بیں ہیں اور خود آراء

پھرتے ادھر کدھر ہو کس کی تلاش میں ہو
گم ہے تمھیں میں یارو باغِ ارم تمہارا (۳۳)

وہ قوم جو جہاں میں کل صدرِ انجمن تھی
تم نے سنا بھی اس پر کیا گزری انجمن میں (۳۴)

یارانِ تیز گام نے محمل کو جالیا
ہم محوِ نالۂ جرس کارواں رہے (۳۵)

روتے ہیں یار ہم پر ہنستے ہیں یار ہم پر
یاں تک ہماری پہنچی اب ناتوانیاں ہیں
کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانوں اٹھتی جوانیاں ہیں
فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں
گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں
رونے میں تیرے حالیؔ لذت ہے کچھ نرالی
یہ خوں فشانیاں ہیں یا گلفشانیاں ہیں
یاروں کو تجھ سے حالیؔ اب سرگرانیاں ہیں
نیندیں اُچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں (۳۶)
کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں

مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں (۳۷)
سخن پر ہمیں اپنے رونا پڑے گا
یہ دفتر کسی دن ڈبونا پڑے گا
ہوئے تم نہ سیدھے جوانی میں حالیؔ

مگر اب میری جان ہونا پڑے گا (۳۸)
نہ لینے دے گا جنت میں بھی آرام
یہی گر جذبۂ حبِ وطن ہے (۳۹)

غفلت ہے کہ گھیرے ہوئے ہے چار طرف سے
اور معرکۂ گردشِ ایام ہے درپیش
جی اس کا کسی کام میں لگتا نہیں زنہار
ظاہر ہے کہ حالی کو کوئی کام ہے درپیش (۴۰)

تذکرہ دہلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ

نہ سنے جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہر گز
کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

ڈھونڈتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب
درد انگیز غزل کوئی نہ گا نا ہر گز
بزمِ ماتم تو نہیں بزمِ سخن ہے حالیؔ
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز (۴۱(

ہوا کچھ اور ہی عالم میں چلی جاتی ہے
ہنر کی عیب کی صورت بدلتی جاتی ہے (۴۲(

سپر بھی دی تو نے تیغ بھی دی مگر دئیے ہاتھ باندھ سب کے
جہیں تھا یاں اختیارِ سب کچھ انہیں بھی بے اختیار دیکھا (۴۳(

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالیؔ نے دکاں سب سے الگ (۴۴(

ہو چکے حالیؔ غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا (۴۵(

حالیؔ بھی پڑھنے آئے تھے کچھ بزمِ شعر میں
باری تب ان کی آئی کہ گل ہو گئے چراغ (۴۶(

حالیؔ نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح رہے رات بھر کہاں (۴۷(

دعویٰ عشق و محبت پہ نہ جانا ان کے
ان میں گفتار ہی گفتار ہے کردار نہیں (۴۸(

یوں تو آیا ہے تباہی میں یہ بیڑا سو بار
پر ڈراتی ہے بہت آج بھنور کی صورت (۴۹(

افسوس کہ غفلت میں کٹا عہدِ جوانی
تھا آبِ بقا گھر میں مگر ہم نے نہ جانا (۵۰(

اے شعر دلفریب نہ ہو تُو تو غم نہیں
پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دلگداز بھی (۵۱(

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے
کل خزاں آکے بتا دے گی وطن کس کا ہے (۵۲(

افسانہ تیرا رنگیں روداد تری دلکش
شعر و سخن کو تو نے جادو بنا کے چھوڑا (۵۳(

ذرہ ذرہ ہے مظہرِ خورشید
جاگ اے آنکھ دن ہے رات نہیں (۵۴(

کرو علم سے اکتسابِ شرافت
نجابت سے ہے یہ شرافت زیادہ

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ (۵۵(

معنی کا تم نے حالیؔ دریا اگر بہایا
یہ تو بتائو حضرت کچھ کرکے بھی دکھایا
اے عشق دل کو رکھا دنیا کا اور نہ دیں کا
گھر ہی بگاڑ ڈالا تو نے بنا بنایا (۵۶(

حالیؔ کٹے گا کاٹنے ہی سے یہ بے ستوں
حل ہوں گی مشکلیں نہ یہ آساں کئے بغیر (۵۷(

حواشی:

)۱ (ڈاکٹر سید اعجاز حسین مضمون ۔ ''داغؔ کا فن اور شخصیت '' مشمولہ کلاسیکی شعراء پر تنقیدی مقالات مرتبہ ایم حبیب خان، ص:۷۸

)۲(ڈاکٹر اے بی اشرف،ادب اور سماجی عمل،ص: ۲۷

)۳(تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (دسویں جلد) ،ص: ۱۲۰
)۴(مجتبیٰ حسین ، ادب و آگہی، ص: ۳۸۶۔۳۷۴
)۵ (دیوانِ حالیؔ ، ص: ۱۱۷
)۶(ایضاً ، ص:۶۳
)۷(ایضاً، ص:۷۰
)۸(ایضاً ، ص: ۶۸
)۹(ایضاً ، ص:۶۶
)۱۰(ایضاً ، ص:۱۱۶
)۱۱(ایضاً ،ص:۹۵
)۱۲(ایضاً ، ص:۶۷
)۱۳(ایضاً، ص:۱۰۱
)۱۴(ایضاً ، ص:۶۶
)۱۵(ایضاً ، ص:۱۱۸
)۱۶(ایضاً ، ص:۵۷
)۱۷(ایضاً ، ص:۱۱۳
)۱۸(ایضاً ، ص:۱۱۸
)۱۹(ایضاً، ،ص:۱۲۰
)۲۰(دیوانِ حالی ، ص: ۶۴
)۲۱(ایضاً ، ص:۶۷
)۲۲(ایضاً ، ص:۱۲۱
)۲۳(ایضاً ، ص:۱۰۴
)۲۴(ایضاً ، ص:۱۱۷
)۲۵(ایضاً ، ص:۱۰۵
)۲۶(ایضاً ، ص:۶۷
)۲۷(ڈاکٹر وقار احمد رضوی، تاریخِ جدید اُردو غزل،ص: ۱۸۱
)۲۸(دیوانِ حالی،ص: ۶۲
)۲۹(ایضاً ، ص:۵۵
)۳۰(ڈاکٹر حسن اختر، تنقیدی اور تحقیقی جائزے،ص: ۱۲۵۔۱۲۲
)۳۱(شجاعت علی سندیلوی '' حالی کی شاعر '' مشمولہ کلاسیکی شعراء پر تنقیدی مقالات ۔ مرتبہ ایم حبیب خان ص:۶۵
)۳۲(فراق گورکھپوری ، اندازے ،ص: ۱۷۵
)۳۳(دیوانِ حالیؔ ،ص: ۵۷۔۵۶

)۳۴(ایضاً ،ص:۱۰۰
)۳۵(ایضاً، ص:۱۱۶
)۳۶(ایضاً، ص:۹۶۔۹۵
)۳۷(ایضاً، ص:۱۰۴
)۳۸(ایضاً، ص:۶۱
)۳۹(ایضاً، ص:۱۲۰
)۴۰(ایضاً، ص:۸۶۔۸۵
)۴۱(ایضاً، ص:۸۳۔۸۲
)۴۲(ایضاً، ص:۱۱۰
)۴۳(ایضاً، ص:۵۲
)۴۴(ایضاً، ص:۹۲
)۴۵ (دیوانِ حالی،ص:۶۲
)۴۶(ایضاً، ص:۹۰
)۴۷(ایضاً، ص:۱۰۱
)۴۸(ایضاً، ص:۹۹
)۴۹(ایضاً، ص:۷۱
)۵۰(ایضاً، ص:۵۷
)۵۱(ایضاً، ص:۱۱۲
)۵۲(ایضاً، ص:۱۰۹
)۵۳(ایضاً، ص:۵۶
)۵۴(ایضاً، ص:۱۰۲
)۵۵(ایضاً، ص:۱۰۷
)۵۶(ایضاً، ص:۵۹
)۵۷(ایضاً، ص:۸۰

کتابیات:

)۱ (الطاف حسین حالیؔ (خواجہ)، دیوانِ حالی، اردو اکیڈمی سندھ،س۔ن
)۲(ایم حبیب خان (مرتب)، اُردو کے کلاسیکی شعراء پر تنقیدی مضامین ، انڈین بک ہائوس علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۶۳ء
)۳ (اے بی اشرف، ادب اور سماجی عمل،کاروانِ ادب ملتان، ۱۹۸۰ء
)۴(حسن اختر (ملک)، تنقیدی اور تحقیقی جائزے،فروغِ ادب گوجرانوالہ، ۱۹۹۲ء
)۵(فراق گورکھپوری، اندازے،ادارۂ فروغِ اردو، لاہور، ۱۹۵۶ء

)۶(فیاض محمود(کیپٹن) مؤلف، تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند، دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۷۱ء
)۷(مجتبیٰ حسین، ادب و آگہی، مکتبۂ افکار، کراچی،س۔ن
)۸(وقار احمد رضوی، تاریخِ جدید اردو غزل، نیشنل بک فائونڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء
/...../